Langat Singh College, Muzaffarpur

NAAC Grade – 'A'

(A Constituent unit of B.R.A. Bihar University, Muzaffarpur)

H.O.D.
PG Deptt of Urdu

Email:
lscollegeprincipal@gmail.com

Ref. No.:..........

Date : 27.04.2020

B.A (Part-III) Urdu Hons

Paper – V

Topic – Tanqueed, Moqadma-e-Sher-o-Shayeree

Dr Zarina Rahman
Associate-Professor
Department of Urdu
L. S. College, Muzaffarpur
Contact No - 9334940186

Contact day and time –
Fri, Sat – 11 AM to 1 P.M

Zarina Rahman

Dr. ZARINA RAHMAN
Head
Department of Urdu
L. S. COLLEGE
Muzaffarpur

مقدمہ شعر و شاعری تنقید کی پہلی کتاب ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔
حالی کے مقدمہ شعر و شاعری پر ناقدانہ نگاہ ڈالیے
حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے
حالی تنقید کے پہلے مرد میدان ہیں اور مقدمہ شعر و شاعری اصولی تنقید کی پہلی کوشش

جواب: حالی کی تنقیدی تصانیف میں "مقدمہ شعر و شاعری" کو اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہے۔ حالی نے اپنے دیوان کے مقدمے میں ان چیزوں کا جائزہ لینا چاہا جن سے شاعری، شاعری ہوتی ہے۔ جو تہذیب کا سرمایہ اور تمدن کی میراث ہوتی ہے۔ حالی نے جب اس عنوان پر قلم اٹھایا تو ان کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اردو شاعری کے اہم اصناف کا جائزہ لیں اور ان کی خوبیاں اور خرابیاں لوگوں کو بتائیں تاکہ اردو ادب کے شیدائیوں کو یہ معلوم ہو جائیں کہ ان کے پاس کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے۔ دوسرے حصہ پر جب لکھنے آئے تو جوش تحریر میں بہت زیادہ لکھتے چلے گئے یہاں تک کہ یہ مقدمہ اتنا مبسوط ہو گیا کہ اپنی جگہ ایک کتاب ہے۔

شعر و شاعری کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں انہوں نے نفس شعر پر اظہار خیال کیا ہے اور دوسرے حصہ میں اردو شاعری کا جائزہ لیتا ہے۔ غدر کے پہلے کا اردو ادب اس قدر مقدار میں اہمیت سے زیادہ مذہبی جواز کا خبط سوار ہے چنانچہ جو لوگ تمہید کے طور پر تذکروں میں شاعری کا ذکر کرتے ہیں وہ اسی بحث میں پڑ جاتے ہیں کہ شعر کہنا مذہبی حیثیت سے درست ہے کہ نہیں اور قرآن شریف کی جو آیتیں موزوں ہیں ان کو شعر کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ کہیں کہیں لوگوں نے شاعری کی ضرورت اور اس کی تاثیر پر اظہار خیال کیا ہے لیکن یہ اس قدر بکھرا ہوا ہے کہ تمام پڑھنے والوں کی نگاہوں میں نہیں آتا۔ غدر کے بعد ادبیات میں جب ایک نئے دور کا آغاز ہوا تو آزاد نے آب حیات میں شاعری کی سماجی اہمیت تسلیم کی اور زندگی و معاشرت کے مختلف اثرات کا اثر شعر پر ظاہر کیا لیکن نفس شعر پر اظہار خیال ان کے دائرہ اثر سے ہی باہر ہے تفصیل سے پہلی دفعہ اس کا ذکر حالی کے مقدمہ میں ملتا ہے اس بنا پر اس مقدمہ کو اردو تنقید کی پہلی کتاب کہتے ہیں۔

حالی نے مقدمہ کے حصہ اول میں شاعری کے مذہبی جواز کو چھوڑ کر اس کے معاشرتی پہلو پر بحث کی ہے۔ اس کی ابتدا ہی اس انداز سے کی ہے کہ شاعری ایک سماجی آلہ معلوم ہوتا ہے جس کا زندگی سے براہ راست تعلق ہے جس کے اثرات معاشرہ میں اور تہذیب پر نمایاں ہوتے ہیں انہوں نے افلاطون کے اس نظریے کی مذمت کی ہے جس میں اس نے شاعری کو سماج کے لئے ایک غیر مفید کام اور شاعروں کو تہذیبی ترقی اور ذہنی ارتقا میں بے کار سمجھا جاتا تھا انہوں نے اسی بنا پر لوگوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا چاہا تھا کہ شاعری کو محض تفریح کا آلہ یا بے کار مشغلہ نہیں سمجھنا چاہئے اسی تائید میں انہوں نے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن میں شاعری نے سماج کی انقلابی کروٹوں میں اہم حصہ لیا ہے یہ مثالیں صرف یورپ کی نہیں بلکہ ایشیائی ممالک کی بھی ہیں۔

جس زمانہ اور جن حالات میں حالی نے یہ کتاب لکھی ہے اس وقت سب سے اہم بات لوگوں کو یہ بتانی تھی کہ شاعری بے کار نہیں بلکہ زندگی سے اس کا گہرا تعلق ہے تاکہ اس اصول کے ذہن نشین ہونے کے بعد لوگوں کو یہ بتایا جا سکے کہ آخر انیسویں صدی کی شاعری ان کی زندگی سے دور کیوں ہے

اس کے بعد شاعری کو بھی نئی زندگی کی تبدیلیوں کے ہمدوش لایا جا سکے اور اس خاکستر میں جہاں نئی تعمیر میں اس سے بھی مدد لی جا سکے۔

حالی نے سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیا ہے کہ شاعری ایک سماجی آرٹ ہے جو سماج کو مختلف صورتوں سے متاثر کرتا ہے اس کے علاوہ شاعری اپنے دور کا آلہ بھی ہے دونوں ایک دوسرے کے اثرات قبول کرتے رہتے ہیں اسی لئے ہر زمانہ کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس دور کے حالات سے بھی واقف ہونا چاہئے جو شاعر محبت کی جھوٹی داستانیں نظم کرتے رہتے ہیں جس سے زندگی اور زمانہ سے کوئی واسطہ نہیں جو حقیقی جذبات و احساسات کا ترجمان نہیں وہ شاعری نہیں ہے جاں صرف اوقات اور بے کار محض ہے۔

اچھی شاعری زندگی کو بہتر بنانے اور اس کو سنوارنے کا کام کرتی ہے لیکن شاعری کوتوال شہر کی طرح آئین مرتب نہیں کرتی۔ پھر ایک طبقہ عورت کے ذکر ہی کو خرابی اخلاق کا ذمہ دار سمجھتا ہے اور دیدہ دانستہ ایک حقیقت سے انکار کرتا ہے جو زندگی کا لازمی جزو اعظم ہی نہیں بلکہ اسکی تخلیق و تکمیل کا ذریعہ عظمیٰ ہے عورت کے ذکر و سایہ سے گریز کی تعلیم دینا ہی نسلوں کے ذہن میں مریضانہ تصورات پیدا کرتا ہے جو خرابی اخلاق کا ذمہ دار ہے اسی وجہ سے حتی الواسع اردو شعراء و فنکار تمام دوسرے ممالک کی طرح اپنے فن کا محور ہمیشہ عورت کو رکھتے ہیں۔ اس کے حسن کی داستانیں، اس کے عشق کے افسانے ان کا موضوع ہیں اور انہوں نے بار بار اسی حقیقت پر زور دیا ہے کہ حسن و عشق کا تذکرہ فطری اور حقیقی ہیں اس کے پاک ذکر سے پرہیز کے باعث عورت ہماری نسلوں کے اعصاب پر سوار ہو گئی ہے اور مریضانہ طور پر تصورات کو آلودہ کرتا ہے۔ آرٹ کا مقصد ہماری زندگی کی تمام فطری خواہشوں کی صحت مندانہ ترقی کا نقطۂ نظر برقرار ہونا چاہئے جب تک فنکار اپنے موضوع میں یہ نقطۂ نظر برقرار رکھتا ہے اور اسی سے ذہن لذت پرستی نہیں سیکھتی تب تک وہ فنی رہتا ہے اور جہاں سے اس میں لذت پرستی کا عنصر آ جاتا ہے تو وہ ادب فنی نہیں رہتا بلکہ فحاشی اور عریانی ہو جاتی ہے۔

شاعری موضوع سے نہیں فن سے ہے دیکھنا یہ چاہئے کہ موضوع کو کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ خواہ کسی عورت کے تعلقات ہوں یا دو ملکوں کی لڑائی یا چور بازاری کا مسئلہ اردو ادب میں بہت ساری ایسی نظمیں ہیں جن میں حسین عورتوں کا ذکر ہے دل فریب گلزاروں کا بیان ہے لیکن وہ اچھی اور کامیاب نظمیں ہیں۔ اسی طرح متعدد ایسی نظمیں بھی ہیں جن میں امور جنگ کا تذکرہ ہے یا امریکی ڈالر شاہی کے فسانے مگر وہ کامیاب ہیں ہمارے شعرا ادب ابتدا سے آج تک نغمۂ محبت گاتے آئے لیکن ان کے تمام اشعار یکساں درجۂ اول کے نہیں یہ تفریقات فن کی خوبی پر محمول ہے۔

ایک طرف دنیا میں صنعتی نظام اور اس کے اثرات سے متوسط طبقہ کے مسائل ابھرتے جا رہے تھے دوسری طرف ہندوستان پر انگریزی سامراج کی گرفت مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی کہ قومی کردار میں جو بلند خودداری اور عالی حوصلگی موجود تھی وہ غلامی کی چکی میں پس پس کر مردہ ہوتی جا رہی تھی جن کے آباؤ اجداد کی متروکہ جائداد موجود ہے وہ اس کے استعمال کا صحیح طریقہ نہیں جانتے اور عیش و عشرت میں اسکو برباد کر رہے ہیں۔ مقاصد شاعری کا تقاضا تھا کہ ان مسائل کو اپنے کلام میں جگہ دے

لیکن بیشتر شعراء اپنے خیالی محبوب کی موہوم کمر کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اپنے
اس فعل کو عینی حیات جانتے تھے بشخصیت کے مسخ ہوئے کا اس سے بڑھ کر اور کیا
ثبوت ہو سکتا ہے جو لوگ نئی شاعری کا نام لے رہے تھے ان کو شعریت سے بیگانہ اور
شاعری سے ناواقف سمجھتے تھے۔ انکی مثال کنویں کا مینڈک سے بھی گئی گزری تھی جو
سمندر کے پرشور و تلاطم خیز موجوں سے اسی لئے ہوشیار نہیں ہوتا کیسے جب چاہیں
گے ایک جست میں دوسرے کنارے پہنچ جائیں گے۔ حالی نے اسی مسخ شدہ ذہنیوں کو
پر اپنے مقدمہ سے ضرب کاری لگائی ہے اور معائب غزل کو اس طرح شمار کیا ہے

(۱) اردو غزل تقلیدی ہوگئی ہے اس میں شاعر اپنے احساسات بیان نہیں کرتا بلکہ ادا
شدہ خیالات کو دہرایا جاتا ہے۔

(۲) غزل کے جذبات و بیانات مشاہدہ اور اصلیت پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ ان کا انداز اس میں
روایتی ہے۔

(۳) اب اردو غزل میں قفس و آشیانہ، صیاد و جلاد، قاتل و شربت، شیخ و بیمار، رقیب
و ناصح حقیقت نہیں ہوتے اور نہ اس سے کوئی گہرے معنی مراد لئے جاتے ہیں۔ پہلے کے شعراء
کے یہاں یہ الفاظ علامتوں کی حیثیت سے مستعمل ہوتے تھے لیکن بعد والے شاعر جو
زندگی کی اصل روح سے بیگانہ اور ادنیٰ درجہ کی ذہنیت رکھتے تھے انکو لفظی معنی میں استعمال
کرنے لگے جس سے ان کی معنویت و جامعیت مفقود ہوگئی یہی بات محبوب کے
متعلق بھی ہے۔

(۴) اردو غزلوں میں مبالغہ بے کیفی کی حد تک آگیا۔ لاغری کا ذکر ہے تو اس حد تک کہ آدمی
تو آدمی، عاشق موت کو بھی ڈھونڈے نہیں ملتا۔

(۵) تشبیہات و استعارات کا دائرہ بھی اردو غزل میں محدود ہو گیا ہے تکرار سے
ان میں بڑی بدمزگی و بے کیفی پیدا ہو گئی ہے

(۶) ردیف و قوافی کے قیود فائدہ رسائی کے بجائے مضر ہیں لوگ صرف ردیف و قوافی
کے اعتبار سے مضمون نظم کرتے سمجھتے ہیں کہ انہوں نے مقصد شاعری کو پورا کر دیا ہے

حالی کے بیان کردہ غزل کی برائیاں دراصل صنف غزل کی برائیاں نہیں بلکہ
ان شاعروں کے نقائص و معائب ہیں جو صلاحیت غزل گوئی سے بعید و بیگانہ رہ کر غزل
گویوں کی نقالی کی جس سے شاعری میں جدت تنوع اور اصلیت نہیں رہ گئی اور بیان
کردہ سارے عیوب آ گئے۔ ورنہ اردو ادب پر غزل کے احسانات وسیع ہیں اظہار و
بیان کے پُرکیف انداز اسی نے بخشے ہیں۔ اس کامیاب اشعار نے محبت کی وادیوں کی ایسی
نشاندہیاں کی ہیں جو کسی زبان کی عشقیہ شاعری کے لئے مایہ ناز ہیں اسی نے ایک شعر میں وسیع
معنی کو بیان کر دینے کی صلاحیت نے اختصار و جامعیت کی راہ دکھائی ہے۔ اور قفس
قفس و آشیانہ، شمع و انجمن کی علامتیں دے کر ادب کو نئی وسعتیں عطا کی ہیں، یہی علامتیں
جب خوبی و فنکاری سے استعمال ہوتی ہیں تو اپنے اندر معنی کی ایک وسیع دنیا رکھتی ہیں جب میر نے
کہا تھا ۔ پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے   جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
یا اقبال نے جب کہا ۔
مو بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی   بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں۔

یا فراق نے کہا

"کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا   کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو"

تو ان اشعار میں کسی پرندے یا کسی گلاب کے پھول یا کسی شاعر کا ذکر نہیں بلکہ ان علامتوں کے استعمال سے شاعر نے ایک وسیع مضمون کو مختصر الفاظ میں ادا کر دیا ہے جس سے بیان میں رمز و اشاریت بھی باقی ہے اور مفہوم بھی ادا ہو گیا ہے۔ اس طرح مضامین دوسروں کی نقل میں بغیر محسوس کئے ہوئے بیان کر دیئے جائیں تو ان کو رسمی اور تقلیدی کہتے ہیں اور غیر شاعر کے ہاتھوں میں پڑ کر ہمیشہ اچھے شعروں کی نقل میں برے اشعار لکھے جاتے رہے ہیں۔

حالی نے اسی تقلیدی اور رسمی شاعری کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ انہوں نے اردو غزل کے اچھے شعروں کی تنقیص نہ کی لیکن تقلیدی و رسمی شاعری کے خلاف اس زور سے اعلان جنگ کیا ہے کہ عمومی طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مراثی کے ماسوا اردو کی تمام شاعری بیکار و لغو ہے حالانکہ اصلاً ایسا نہیں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صحیح معنوں میں اردو کے پہلے نقاد مولانا حالی ہیں ہی نہیں بلکہ دور حاضر تک ان کے ٹکر کا کوئی دوسرا نقاد نہیں پیدا ہوا ہے۔ حالی نے اردو میں سائنٹفک تنقید کی بنیاد ڈالی ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ بذات خود سائنٹفک تنقید کے مفہوم سے نہ آشنا ہوں مگر چونکہ وہ پیدائشی نقاد تھے اس لئے ان کے دماغ نے تنقید کے بارے میں سائنٹفک طرز غور کیا اور اردو میں صحیح تنقید کی داغ بیل ڈالی جس پر آج بھی اردو کے ذہین نقاد مختلف رنگ کے بیل بوٹے بنا رہے ہیں۔

دراصل اردو تنقید اور حالی اجزا ایسے لاینفک ہیں جن کو جدا کرنا محال ہے۔ ان کا تنقیدی کارنامہ "مقدمہ شعر و شاعری" ہے جس کو اردو تنقید کا دستور العمل کہنا چاہئے جس طرح کارل مارکس نے "ڈی کیپیٹل" لکھ کر اشتراکیت کا دستور العمل شائع کیا ہے اسی طرح حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو تنقید کا دستور العمل پیش کیا ہے۔ ہم ان کی اس کتاب کو تنقید کا حرف اول کہہ سکتے ہیں۔ جس سے آج بھی اردو نقاد اس کتاب سے مستفید ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے

تنقید کی تعریف کرتے ہوئے اس کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں بتاؤ۔

تنقید کسی ادب پارے کے محاسن و معائب کو پرکھنے اور جانچنے کا نام ہے اور بقول آل احمد سرور اس پرکھ اور جانچ میں تعارف ترجمانی اور فیصلہ سب کچھ ہوتا ہے۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اچھائی اور برائی کا تعین خود اس بات سے ہوتا ہے کہ ہم کسی ادب پارے کو کسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے، اخلاقی نقطۂ نظر سے، معاشی نقطۂ نظر سے، مادی نقطۂ نظر سے، جمالیاتی نقطۂ نظر سے، تاثراتی نقطۂ نظر سے، تاریخی نقطۂ نظر سے یا نفسیاتی نقطۂ نظر سے نقطۂ نظر کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کے حسن و قبیح کے پیمانے بھی بدلتے جائیں گے۔ چنانچہ آج تنقید کے مختلف دبستانوں یا نظریوں کا وجود اسی حقیقت کے نتیجے میں ہیں۔ مختلف ناقدین نے مختلف علوم کی روشنی میں ادبی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے اور بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی "اسی لئے تنقید آج ایک فن بھی ہے اور ایک علم بھی، سائنس بھی ہے اور جمالیات بھی، فلسفہ بھی ہے اور نفسیات بھی، تاریخ بھی ہے اور عمرانیات بھی، علم الاقوام بھی ہے اور معاشیات بھی تہذیب بھی ہے اور سیاسیات بھی"۔

دراصل فکر انسانی میں جو تنوع نظر آتا ہے اسکی روشنی میں تنقید بھی بوقلموں میں نظر آتی ہے۔

اردو ادب میں تنقید کا وجود مغربی ادب سے آیا ہے۔ تنقید اب اردو ادب کا بہت اہم سرمایہ ہے کیونکہ اسی سے ہمارا اردو ادب صحت مند ہوا ہے۔ تنقید سے پہلے ہمارے یہاں صرف تذکرے ملتے ہیں۔ کیونکہ تنقید کے اصول اور اصول نقد سے ناواقف تھے ان کے سامنے صحت مند تنقید کا کوئی نمونہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا قدیم شعراء، اساتذہ اور تذکرہ نگار تنقیدی اصطلاحوں سے تہی دامن تو نہیں تھے لیکن ذاتی پسند اور ناپسند ان کا تنقید کا معیار تھا جبکہ ایک اصولی اور فنی تنقید میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مولانا حالی، شبلی، آزاد اور عبدالحق نے اردو تنقید کو تذکروں کے عہد سے نکالا اور اسکو ایک مستقل فن کا درجہ عطا کیا۔ کلیم الدین احمد، آل احمد سرور احتشام حسین اور حسن عسکری جیسے ذہین، جید اور جلیل القدر ناقدین نے اسکو مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے سربلند کیا۔ آج تنقید کا جو ذوق ہم دیکھ رہے ہیں یہ کہ انہیں بزرگوں کی دین ہے۔ اور اب تو ان کے بعد بھی بہت باشعور و باصلاحیت نقاد اس میدان میں نظر آ رہے ہیں جن کے تخلیقات سے ہمارے تنقیدی سرمائے میں اضافہ ہو رہا ہیں۔

تنقید کا اصل مقصد کسی فن پارہ کی ماہیت، اغراض و غایت اور افادیت کا سراغ لگانا ہے چنانچہ انگریزی کے مشہور شاعر و نقاد ٹی ایس

ایلیٹ نے لکھا ہے کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ تنقید وہ نقطہ فکر ہے جو یا تو یہ معلوم کرنے کی جستجو رہی ہے کہ شاعری کیا ہے۔ اس سے حاصل کیا ہوتا ہے۔ اس سے کن تمناؤں کی تسکین ہوتی ہے۔ اشعار کیوں لکھے جاتے ہیں اور کیوں پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔"

یہاں پر ایلیٹ نے تنقید کا جو تعلق شاعری سے بتایا ہے وہ صرف شاعری کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ بات سب پر لاگو ہوتی ہے جیسے افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری اور خود تنقید نگاری پر بھی تنقید کا فن بہت نازک مزاج ہے۔ یہاں کسی بھی طرح کی جانبداری کی گنجائش نہیں ہے۔ مکمل غیر جانبداری اور دیانتداری اور بے لاگ زاری کے بغیر کوئی بھی تنقیدی فیصلہ قابل احترام نہیں ہو سکتا تنقید کی غیر جانبدارانہ حیثیت کے سلسلے میں سبھی مشرق کے تمام ناقدین اتفاق کرتے ہیں اس لئے سرور صاحب کے اس خیال سے ہمیں اتفاق کرنا چاہئے کہ "تنقید کا کام فیصلہ کرنا ہے۔ تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ جھوٹ اور سچ بلندی و پستی کے بارے میں بتاتی ہے۔ تنقید کی اہمیت و افادیت کے سلسلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کام ادب کی توضیح تفسیر اور تشریح ہے۔ ساتھ ہی تربیت ذوق اور اصلاح بھی اس کے فن میں شامل ہے۔

تنقید ادب کی ایک شاخ ہے اور اہم شاخ ہے اچھی تنقید نہ صرف معلومات فراہم کرتی ہے بلکہ ایک خوشگوار احساس بھی بخشتی ہے مگر جو اس کے لئے ایک فطری ریاضی لازمی ہے۔ ایک کامیاب نقاد کے لئے ذہن ادراک، زندہ احساس اور وسعت نظر کا ہونا ضروری ہے۔ ان اوصاف سے بے نیاز ہو کر کوئی ناقد اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتا ہے۔ وسعت نظر اور وسعت مطالعہ اور غیر جانبداری ایک نقاد کی بنیادی شرطیں ہیں۔ تنقید ایک دشوار فن ہے لیکن عام طور پر تنقید کے سلسلے میں بڑی سہل نگاری سے کام لیا جاتا ہے اس بات سے اس فن کی عظمت مجروح ہوتی ہے

تنقید کی ماہیت، افادیت اور اہمیت اس طرح آپس میں ملے ہیں کہ ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا ہے تنقید کی تعریف ہی میں اس کی افادیت بھی پنہاں ہے اور جو اس کی افادیت ہے وہی اہمیت ہے مثلاً تنقید کے متعلق جب آل احمد سرور یہ کہتے ہیں کہ اچھی تنقید محض معلومات فراہم نہیں بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مورخ، ماہر نفسیات، ایک شاعر ایک مجسم کرتا ہے تو یہ صرف تنقید کی تعریف نہیں ہوتی بلکہ اس کی افادیت بھی ہوتی اور یہ تو مسلم ہے کہ جب تک ہمیں کسی شئے کی

افادیت کا احساس نہیں ہوگا اسکی طرف توجہ نہیں کر سکے۔
تنقید کی غیر معمولی معنوی مقبولیت ہی اس کے فوائد کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ ساتھ
ہی اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

تنقید کی اہمیت کے سلسلے میں ٹی ایس ایلیٹ کا کہنا ہے کہ "تنقید
ہماری زندگی کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی سائنس" اور یہ بات بہت صحیح ہے
جس طرح سائنس چلنے پر ہی زندگی کا دارومدار ہے ٹھیک اسی طرح ادب کی زندگی
کے لئے تنقید ضروری ہے۔ اگر تنقید کی روشنی نہ ہو تو ہم صحیح اور غلط، بلند و پست،
بھلا اور برا، معیاری اور غیر معیاری ادب میں فرق نہیں کر سکتے اور ادب بلاشبہ
اس جنگل کی طرح ہو جائے گا جس میں موزونیت اور خوش سلیقگی اور فقدان
اور کمی ہو۔ تنقید کے بغیر ایک صحت مند اور صحت بخش ادب کا تصور ہی
نہیں کیا جا سکتا ہے۔